تیئیسواں باب: سورۃ القیٰمۃ (آیات 1 تا 3)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1984ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القیٰمۃ سے ہو رہا ہے: (75:1)۔

کشمکشِ حق و باطل کے آخری مراحل

آپ کو یاد ہوگا کہ ان سورتوں میں قریباً بیس، تیئیس سال پہلے سے، حق و باطل کی جو کشمکش چلی آ رہی تھی وہ اب اپنے آخری مراحل میں آ پہنچی ہے۔ اب ان آخری تصادمات کا ذکر آ رہا ہے، اس آخری ٹکراؤ کا ذکر آ رہا ہے۔ یوں تو حق و باطل کے یہ تصادمات پہلے ہی دن سے چلے آ رہے ہیں کہ آدم اور ابلیس دونوں ایک ہی وقت میں اسٹیج پہ آتے ہیں اور ابلیس نے آخری آدمی تک مہلت لے رکھی ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں اس تصادم نے جو کیفیت یا رنگ اختیار کر رکھا تھا، وہ تاریخ کا ایک عدیم النظیر واقعہ ہے۔ اب اس کا آخری دَور آ رہا ہے۔ اب اس سورۃ کی ابتداء ہو رہی ہے۔

عزیزانِ من! پچھلی سورتوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ کو ایک جماعت سازی کے لیے کہا گیا۔ کائنات کے ایک شجرِ خزاں دیدہ پر بہار نو لانے کے لیے یہ کہا کہ قُمْ (74:2) اٹھ۔ اس انقلاب کی اصل جو چیز ہے وہ قُمْ یہ ہے۔ یہ یونہی اٹھنا نہیں ہے۔ To rise کے معنی صرف بیٹھے ہوئے کا اٹھنا ہی نہیں ہوتا، یہ وہ ''اٹھنا'' ہے جسے کسی مقصد کے لیے Rising (اٹھنا) کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہی ہے جو قُم تھا۔ اب وہ قُم ہی ہے، جو آگے چل کے آ رہا ہے۔ کہا کہ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (74:2) ان سے کہو کہ میں قیامت کے حادثہ کو، واقعہ کو، دَور کو، رنگ کو، دن کو قیٰمۃ کو شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ قیام اور قُمْ کا ایک ہی مادہ (Root) ہے۔ قیام کے ''م'' کے بعد عربی زبان کے اندر جب کول ۃ لگائی جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں: ''وہ کام جو یکبارگی کیا جائے، شدت کے ساتھ، یکبارگی کیا جائے۔'' تو قیامت کا لفظ حقیقت میں قیام ہی ہے، وہ قیام جو بتدریج نہ ہو۔ بتدریج تو وہ آ رہا ہوتا ہے، اب اس میں ایک ایسی اسٹیج آ جاتی ہے کہ جس میں وہ محسوس طور پر یکبارگی اٹھ کے، سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسے قیٰمۃ کہا گیا ہے اور پھر اس کے

شروع میں ''ل'' بھی لگاؤ تو پھر یہ ال عربی و انگریزی کے لفظ The کے مترادف استعمال ہوتا ہے۔ قیـــــامۃ کے ساتھ ال لگنے سے القیامۃ بن گیا' وہ ایک خاص بن گیا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو اس قسم کی قرآن کی اصطلاحات ہیں' جو اس نے واقعات بتائے ہیں' وہ اس دنیا کی' اس قیامت کے متعلق بھی ہیں' یہاں کی جہنم اور جنت کے متعلق بھی ہیں اور جو جہنم اور جنت اس کے بعد یعنی مرنے کے بعد ہے اس پر تو ہمارا ایمان ہے۔ وہ تو ہے ہی۔ تو یہاں بھی وہ جو باطل کا حق کی طرف سے ایک مقابلہ تھا' جو بتدریج ہوتا چلا آ رہا تھا' اب اس میں پھر ایک Strategy (حکمت عملی) ایسی آتی ہے' ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جہاں پھر یہ چیز انقلابی طور پر' اور ارتقائی طور پر منازل طے کرنے کے بعد' آخر میں سامنے آتی ہے۔ اور وہاں ہے جو القیامۃ کہا جاتا ہے۔ یہ قیام سے ہے' جس کے لیے قم (74:2) کہا گیا تھا۔

میں یہاں یہ بات پہلے عرض کر دوں کہ اس قسم کی جو آیات یا سورتیں یا قرآنِ کریم کے واقعات ہیں' اب ان میں یہ ہے کہ اس القیامۃ سے مقصود وہ Rising (اٹھنا) ہے' وہ انقلاب مقصود ہے' جو اس کشمکش کے آخری مرحلے میں نبی اکرم ﷺ اور والذین معہ کے ہاتھوں برپا ہوا۔ یہ اس دنیا کے اندر کا قیام ہے' یا اس سے مراد مرنے کے بعد کی قیامت ہے۔ اب اسے تدبر فی القرآن کہا جاتا ہے۔ اگر کسی نے یہ سمجھا کہ یہ یہاں کے انقلاب ہی کے متعلق ہے تو اس کا کوئی اثر انسان کے ایمان اور عقیدے پر نہیں پڑتا ہے اور پھر وہ انقلاب ختم نہیں ہو گیا بلکہ وہ حق و باطل کا انقلاب ہے' وہ جاری ہے۔ ہمارے لیے بھی یہ احکام ہیں جو نبی اکرم ﷺ یا حضور ﷺ کے ساتھیوں کے لیے تھے' وہ احکام قیامت تک کے لیے تھے اور ہیں اور پھر خاص طور پہ یہ امت جسے قرآن کے الفاظ میں' وارثِ کتاب قرار دیا گیا' اس کے لیے تو قدم قدم پر یہ القیامۃ ہے' یہ جو قیامتِ موجود ہے اس کا دیکھنا بڑا ضروری ہے۔

مردہ قوم کو لفظ قم یا القیامۃ کا ادراک ہی نہیں ہوتا

عزیزانِ من! ہر آن میں' اصل میں' تو ہر سانس میں' انسان کے اندر ایک قیامت پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ ہر دور میں ہوتی ہے' ہر آن میں ہوتی ہے' امت زندہ ہونی چاہیے۔ مردہ کے لیے تو یہ قیامت ہوتی نہیں ہے۔ اٹھنا تو زندگی کے ساتھ ہے۔ مردہ قوم تو جانتی ہی نہیں ہے کہ یہ قیامت ہوتی کیا ہے؟ یہ زندہ قوم کے لیے تھی۔ اگر یہ امت جو وارثِ کتاب ہے زندہ قوم ہو یا زندہ قوم ہو جائے' تو اسے معلوم ہو کہ یہ القیامۃ کیا ہوتا ہے۔ میں نے القیامۃ کے سلسلے میں عرض کیا ہے کہ یہ تدبر فی القرآن کی بات ہے کہ فلاں مقام پر قرآن کی اصطلاح سے کیا مفہوم لیا جانا چاہیے' کیا مفہوم موزوں ہے' یہ لے لیجیے یا دوسرا لے لیجیے' تو یہ بات نہ کوئی تنازع کی ہے' نہ خصومت کی' نہ یہ جھگڑے کی بات ہے۔ یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے' یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے بشرطیکہ یہ قرآن کی جو بنیادی تعلیم ہے اس کے خلاف نہ ہو۔ وہ اس کے مطابق ہے جو جس انداز سے بھی بات کو سمجھا جائے۔ یہی تو فکر اور تدبر کے لیے ہے جو قرآن نے راستے کھلے رکھے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ اس پر کفر کے فتوے نہیں لگنے چاہئیں۔

ہمارے ہاں کفر کے فتوے

ہمارے ہاں تو کفر کے فتوے اس پہ بھی لگتے ہیں کہ آمین اونچی آواز سے کہنی چاہیے یا آہستہ دھیمی آواز سے۔ یہ تدبر فی القرآن تو بڑی چیز ہے بشرطیکہ وہ قرآن کے حدود کے اندر ہو۔ اس کے راستے کھلے ہیں اور اس تدبر کا قیامت تک کے لیے حکم ہے۔ یہی نہیں ہے کہ اس چیز کی اجازت ہے' قرآن کی حامل قوم پر اس چیز کا حکم ہے کہ وہ تدبر کرے۔ تو ہر دور میں قرآن کے اندر تدبر ہوگا۔

کسی دَور یا فرد کا تدبر آنے والے دَور یا فرد کے لیے سند نہیں ہوسکتا

عزیزانِ من! کسی دَور کا تدبر' کسی ایک فرد کا تدبر' آنے والوں کے لیے سند نہیں ہوسکتا کہ وہ اس کی پابندی کریں اور اُسے غیر متبدل سمجھیں۔ غیر متبدل تو صرف کلمات اللہ ہیں۔ انسانوں کی فکر' ان کا تدبر' ان کا غور' ان کا استنباط' ان کے لیے ہوئے معنی' کسی دوسرے کے لیے نہ تو واجب ہوجاتے ہیں اور نہ ہی ہر دَور کے لیے غیر متبدل ہوسکتے ہیں' ورنہ یہ جو تدبر فی القران کا حکم ہے وہ تو ایک خاص دَور پر آ کر ختم ہوجائے گا۔ تدبر فی القرآن کا یہ راستہ اس طرح سے کھلا رہتا تو معلوم نہیں کہ ایک ہزار سال میں قرآن کے کس قدر حقائق بے نقاب ہوکر آج ہمارے سامنے آئے ہوتے لیکن ہم تو وہی ہزار سال پہلے کے دَور پہ رکے ہوئے ہیں' جبکہ انسانی علم کہیں کا کہیں چلا گیا ہے۔ جسے قرآن فطرت کے اشارے کہتا ہے وہ ہم بے نقاب نہیں کر سکے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم فطرت کے حقائق کو بے نقاب کرتے چلے جائیں گے تا آنکہ یہ بات واضح طور پر تمہارے سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ فطرت کے نقاب تو اس دوران اٹھتے گئے' ہم نے ہی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ ہمیں یہ کہا گیا تھا کہ تم آنکھیں نہیں کھول سکتے جبکہ ہماری آنکھیں ہزار برس پہلے کھل گئیں تھیں۔ میں یہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق نہیں عرض کر رہا۔ وہ تو مقام ہی کچھ اور ہے۔ وہ نبوت کا مقام ہے۔ ان کے بعد انسانوں کا جو مقام ہے' تدبر ان کے لیے تھا۔ تدبر کے دروازے کھلے ہونے چاہئیں' ہر دَور میں' ہر فرد کے لیے کھلے ہونے چاہئیں اور اس میں کوئی بات ناراضی اور غصے کی نہیں ہے کہ تمہارے تدبر کا نتیجہ میرے تدبر کے نتیجے سے مختلف کیوں ہے۔ یہ سمجھنے اور افہام وتفہیم کی بات ہے۔ اگر اس میں فرق ہو تو آپس میں سمجھ لینا چاہیے کہ جو بہتر نظر آئے' جو زیادہ حقائق کے نزدیک ہو' جو قرآن کی تعلیم سے زیادہ قریب ہو' وہ بہتر تدبر ہے مگر Final (حرفِ آخر) وہ بھی نہیں ہے۔ آخری حرف تو حقیقت میں صرف قرآن کے کلمات اللہ ہیں۔ اس لیے القیامۃ کے دونوں مفاہیم میں سے جو مفہوم بھی کوئی لینا چاہے' لے لے۔ وہ انقلاب جو اس دَور میں ہوا' یا وہ جو مرنے کے بعد ہوگا' القیامۃ ہے۔ اسے بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (75:1) ان سے کہو کہ نہیں' بات یوں نہیں ہے جسے تم خیال کیے بیٹھے ہو کہ ہم جس طرح جی میں آئے کریں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ میں دورِ قیامت کو شہادت میں پیش کرتا ہوں' جب اعمال کے ظہور نتائج کا وقت آئے گا۔

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (75:2) اور اس شخص کو اس پر شاہد ٹھہراتا ہوں جو اپنی غلطی کے احساس سے نادم ہو [1] (12:53) کہ خدا کا قانونِ مکافات ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ برآمد کرتا ہے خواہ وہ اس دنیا میں اس کے سامنے آ جائے' خواہ مرنے کے بعد۔

نفسِ انسانی پر تحقیق

عزیزانِ من! بات یہ ہے کہ شہادت میں نفسِ لوامہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بات ذرا تفصیل طلب ہے۔ پہلی چیز تو یہی ہے کہ قرآن میں یہ جو نفس ہے یہ شروع سے آخر تک چلا آ رہا ہے۔ اگرچہ عربی زبان کے اعتبار سے اس لفظ کے بہت مختلف اور متعدد معنی ہیں' لیکن جب یہ چیز انسان کے ضمن میں آئے گی تو یہ ایک عجیب چیز ہے کہ جس کے متعلق بتایا ہی نہیں جا سکتا کہ یہ ہے کیا؟ اس میں شبہ نہیں کہ مغرب کے علم النفس کے ہاں یہ ایک الگ علم ہی کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ انہوں نے بڑی تحقیق کی اور سائیکالوجی کے انداز سے کیے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے ہاں Soul [2] (روح) کا اور سائیکی Psyche کا قصہ چلا آ رہا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی یہ کہا ہے کہ کسی زمانے میں' یونان کی فکر میں' اسے Soul یعنی روح کہا' عیسائیت میں آ کر اسے Spirit [3] کہا۔ اس کے بعد' علم کی دنیا میں آئے' تو اسے Mind کہا۔ Mind سے بھی آگے بڑھے' اس سے کام نہیں چلا' پھر اسے (Psyche) سائیکی کہا۔ یہ ان کے ہاں کی چیز آ گئی۔ اس پر تحقیق ہو رہی ہے یعنی یہ بات یہ ہے کہ ایک تو انسان کا جسم ہے' جسے Physical Body (طبعی جسم) کہتے ہیں۔ یہ فزیکل باڈی (طبعی جسم) حیوانی سطح کی چیز ہے' اس کے تقاضے وہی ہیں جو ہر حیوان کے تقاضے ہیں: کھانا' پینا' زندہ رہنا' اولاد پیدا کرنا' ایک وقت کے بعد پھر اس مشینری کا بند ہو جانا' مر جانا۔ اس میں کوئی بھی خصوصیت انسان کی نہیں ہے' یہ اسی سطح کی چیز ہے لیکن اس میں ایک چیز ایسی ہے جو اس سے پہلے کی ارتقائی سطح میں جو Life یا زندگی رہی ہے' یعنی حیوانات کی سطح تک بھی لیجیے' وہاں یہ نہیں ہے اور وہ ہے اختیار اور ارادہ۔

---

[1] یہ جو کہا جاتا ہے کہ انسان کے اندر ایک قوت ہے جو حق اور باطل کی تمیز کر دیتی ہے (اسے ضمیر کی آواز کہتے ہیں) یہ غلط ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو مطلق حق اور باطل میں از خود تمیز کر دے۔ مطلق (Absolute) حق اور باطل کی تمیز وحی خداوندی کی رو سے ہوتی ہے۔ جب کسی شخص سے کسی ایسے فعل کا ارتکاب ہو جائے جو اس بات کے خلاف ہو جسے وہ حق سمجھتا ہے تو اس سے اسے احساسِ ندامت ہوتا ہے۔ اسے آپ ضمیر کی آواز کہہ سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جسے وہ حق سمجھتا ہے وہ فی الواقعہ حق ہو اور جسے باطل سمجھتا ہے فی الواقعہ باطل (نیز دیکھیے 12:53)۔ پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوع اسلام ٹرسٹ رجسٹرڈ' لاہور' ص۔ 1386 فٹ نوٹ نمبر 1۔

[2] William Mc Dougall نے بھی زندگی کے اس واسطے کو Soul (روح) کہہ کر پکارا۔

❸ یاد رہے کہ مغرب میں Matter(مادہ) کے مقابلہ میں Spirit کا لفظ بولا جاتا ہے۔جس سے مقصود غیر مادی (Immaterial) اشیاء ہوتی ہیں۔

انسان کے لیے اختیار وارادہ کی صلاحیت اور توانائی

اب یہاں دو Possibilities (ممکنات) سامنے آئی ہیں: دو راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنا اور دوسرا چھوڑ دینا۔ یہ ایک چیز ہے۔حیوانات تک میں جبلت (Instinct) ہے' وہ ایک ہی راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ان کے ہاں Choice (اختیار) نہیں ہے۔ یہ بکری کے اختیار میں نہیں ہے کہ کبھی جی میں آئے تو گھاس چر لے کبھی جی میں آئے تو گوشت کھالے۔بکری بیچاری تو بکری ہوتی ہے' یہ تو شیر کے اختیار میں بھی نہیں ہے کہ اگر کبھی بھوکا مر رہا ہو تو گوشت چھوڑ کر انگور کھانے شروع کر دے۔اب یہاں یہ چیز آئی ہے کہ انسان کو صاحبِ اختیار بنایا' اسے کام کے لیے ارادہ دیا یعنی پہلے تو یہ ایک چیز کی کہ اسے Choice (اختیار) دیا۔اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ طے کیا جائے کہ کونسا راستہ ہے۔ اس پہ چلنے کا ارادہ کیا جائے یہ خداوندی صفت ہے۔

روح کا مفہوم

عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ انسان کو خدا کی ''روح'' میں سے ایک شمہ ❶ دیا گیا۔''روح'' کے معنی توانائی ہوتا ہے۔اصل توانائی تو یہ ہے کہ آپ خود اپنے ارادے سے ایک چیز کو اختیار کریں۔ یہ بہت بڑی قوت ہے۔یہاں مجبوری نہیں ہے۔ یہ جو خدائی صفت کا ایک شمہ انسان کو دیا گیا تھا' یہ اس کا اختیار وارادہ ہے۔قرآن نے اس کو ''نفس'' سے تعبیر کیا ہے۔یہ اس کے طبعی جسم کی پیداوار نہیں ہے' نہ ہی یہ طبعی جسم سے متعلق جو قوانین ہیں' مثلاً کھانے پینے کے' مریض ہو جانے کے' شفاء پا لینے کے'' اس سے کوئی تعلق ہے۔ یہ طبعی جسم صرف فزیکل یا طبعی چیز ہے۔اس کا تعلق ان سے بھی نہیں ہے' یہ ان قوانین سے بھی ماوراء ہے۔ یہ فیصلہ کرتا ہے' ارادہ کرتا ہے' انسان کے طبعی جسم کو عمل کے لیے آمادہ کرتا ہے' تقویت پہنچاتا ہے' اور اپنے فیصلے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ جو انسان کا کوئی کام یا کوئی عمل ہے' اس کی ذمہ داری جس پہ آتی ہے یہ وہ ہے' جسے نفس کہا گیا ہے: فیصلہ کرنے والا' ارادہ کرنے والا۔پھر یہ وہ ہے جس پر انسان کے عمل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے' یہی ہے' وہ جسے قرآن نفس کہہ کر پکارتا ہے۔اس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ انگریزی زبان میں بھی اس کے لیے یکے بعد دیگرے اتنے الفاظ' اتنی اصطلاحات' اختیار کی گئیں اور پھر Discard (رد) بھی کر دی گئیں' مگر ابھی تک بات نہیں بنی۔

---

❶ ایک مرحلہ تک طریقِ تخلیق' حیوانات اور انسانوں میں مشترک چلا آتا ہے۔اس کے بعد' انسان کی صورت میں' ایک انقلابی تبدیلی (Emergent Evolution) واقع ہوتی ہے' جس میں اس کا تخلیقی سلسلہ حیوانات سے یکسر مختلف ہو جاتا ہے۔یعنی خدا' انسان کو اپنی الوہیاتی توانائی (Divine Energy) کا ایک شمہ عطا کر دیتا ہے۔اسے انسانی ذات (Human Personality) کہا جاتا ہے' جو صاحبِ اختیار وارادہ ہوتی ہے۔حوالہ کے

لیے دیکھیے: (32:9)۔

وہ ''میں'' کیا ہے

عزیزانِ من! قرآن اسے ''نفس'' کہہ کر پکارتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیا ہے؟ اسے تو آپ چھوڑ دیجیے۔ یہ سوچیے کہ آپ جو کہتے ہیں کہ میں نے یہ کیا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ ''میں''[1] کیا ہے جس نے یہ کیا ہے۔ علمی بحث کو چھوڑ دیجیے۔ اصل یہ ہے کہ ہم نے سوچنا چھوڑ دیا ہوا ہے' ورنہ اگر ہم سوچتے تو اس علمی بحث میں جانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ یہ کیا بات ہے! جو ہم کہتے ہیں کہ یہ ''میں'' نے کیا ہے۔ ''میں'' اس کا ذمہ دار ہوں۔ اس ''میں'' سے مراد کیا ہے؟ اگر آپ کے ہاتھ نے چوری کر کے کوئی چیز جیب میں ڈال دی ہے تو یہ ہاتھ تو وہ ''میں'' نہیں ہے۔ آپ یہ نہیں کہتے کہ یہ میرے ہاتھ نے کیا ہے' میں نے نہیں کیا۔ یہ ''میں'' کیا ہے؟ آپ اس علمی مخمصے میں جائیے ہی نہیں۔ جسے آپ کہتے ہیں کہ ''میں'' نے کیا ہے بس وہی تو نفس ہے۔ وہ انسان کا طبعی پیکر نہیں ہے' ہاتھ نہیں' پاؤں نہیں' آنکھ نہیں' کان نہیں۔ وہ یہ چیزیں نہیں ہیں لیکن یہ ان سے الگ بھی نہیں ہیں' اس نے چوری کرنے کا فیصلہ کیا ہے' اس کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا ہے' ہاتھ نے پکڑا ہے' ہاتھ نے چوری کی ہے' ہاتھ جیب میں ڈالا ہے' پاؤں سے بھاگا ہے۔ وہاں سے لے کر یہ ساری چیزیں تو ٹھیک ہیں۔ یہ ایک مشینری ہے' ذرائع ہیں' اس نفس کے فیصلے کے بروئے کار لانے کے۔ تو ذمہ داری تو اس پہ عائد ہوتی ہے جس نے وہ فیصلہ کیا ہے یا وہ ان سے سارا کچھ کرا رہا ہے۔ اسی لیے قرآن اسے ذمہ دار قرار دیتا ہے اور اگلی چیز یہ ہے کہ جسم کی موت کے ساتھ وہ مرتا نہیں ہے۔ وہ اپنی ان تمام ذمہ داریوں کی گٹھڑی لیے ان کے نتائج بھگتنے کے لیے آگے چلا جاتا ہے: اگر یہ اعمال اچھے ہیں تو ان کی آسائشوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے' اور اگر برے ہیں تو ان کے اثرات بھگتنے کے لیے۔ یہ مرتا نہیں ہے۔ یہ اس کی خصوصیت ہے۔ حیوانی سطح زندگی تک حیوان کا جسم مرتا ہے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ انسان میں پہنچ کر اس کا جسم مرتا ہے' اس کا ''میں'' نہیں مرتا۔ یہ ''میں'' اپنی ذمہ داریوں کو لیے ہوئے آگے چلا جاتا ہے۔

---

[1] پروفیسر آروِن شروڈنگر (Erwin Schrodinger :1887-1961) نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے لیکن بڑی اہم ہے۔ اس کا نام ہے: What is Life? جو حضرات اس موضوع سے دل چسپی رکھتے ہوں' وہ اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ وہ اس کتاب کے خاتمہ پر لکھتا ہے: ''میں'' کسے کہتے ہیں؟ اگر آپ ''میں'' کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ انسانی تجارب اور حافظہ سے کچھ زیادہ کا نام ہے۔ یہ وہ پردہ ہے جس پر انسانی حافظہ اور تجربہ کے نقوش جمع ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی داخلی دنیا کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ جسے آپ ''میں'' Porsonality Self,Imness کہتے ہیں۔ اس بنیاد کا نام ہے جس پر تجربے اور حافظے کی عمارت اٹھتی ہے ..... اگر کوئی ماہر عمل تنویم (Hypnotist) ایسا بھی کر دے کہ تمہاری تمام سابقہ یادداشت یکسر ذہن سے محو ہو جائے پھر تم دیکھو گے کہ اس سے تمہاری ''میں'' کی موت واقع نہیں ہو جائے گی۔ لہٰذا انسانی ذات

(Human Self) کی ہستی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔

انسانی نفس کی مختلف اقسام اور خصوصیات

عزیزانِ من! اب اس نفس پر آ جایئے۔ ہمارے ہاں بھی عام طور پر تین نفس گنے جاتے ہیں: نفسِ امارہ [1] نفسِ لوامہ [2] اور نفسِ مطمئنہ [3]۔ قرآن میں ان تینوں کا ذکر ہے لیکن ہمارے ہاں کی اصطلاح اور قرآن کی اصطلاح میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ہمارے ہاں ایسا ہے جیسا کہ یہ تین الگ الگ نفس ہیں: نفسِ امارہ انسان کو برائی کے لیے آمادہ کرتا ہے' نفسِ لوامہ انسان کو اُس بات پر ٹوکتا ہے' ملامت کرتا ہے جو اس نے برا کام کیا ہے اور نفسِ مطمئنہ وہ ہے' جو اس اضطراب سے' اس کشمکش سے' آگے چلا جاتا ہے' وہ اطمینان سے بیٹھا رہتا ہے۔ گویا ہمارے ہاں کچھ تصور ایسا ہے جیسا انسان کے اندر الگ الگ یہ تین نفس ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ تینوں اسی ایک ہی نفسِ انسانی کی الگ الگ خصوصیات ہیں' الگ الگ Aspects (گوشے) ہیں' الگ الگ Chracteristics (خصوصیات) ہیں' الگ الگ Functions (افعال) ہیں۔ یہ تمام اسی ایک ہی نفس کی مختلف خصوصیات ہیں۔ وہی نفس ہے جو یہ سب کچھ کرتا ہے۔

نفسِ امارہ کیا ہے؟

عزیزانِ من! سمجھنے کی بات ہے۔ پہلے تو یہ عرض کر دوں کہ نفسِ امارہ کا ذکر سورۃ یوسف میں آیا ہے۔ وہ قول' ویسے تو عزیز کی بیوی سے منسوب ہے۔ اس نے یہ کہا تھا کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ [4] (12:53)۔ عزیز کی بیوی نے جب اپنی لغزش کا' اپنے جرم کا' اپنے گناہ کا' اعتراف کیا تھا' تو اس نے یہ کہا تھا کہ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ (12:53) میں اپنے آپ کو بری الذمہ نہیں قرار دیتی۔ اصل یہ ہے کہ قرآن نے اس کے یہ الفاظ کوٹ (نقل: Quote) کیے ہیں کہ یہ جو نفس ہے' یہ برائی کے لیے آمادہ کرتا رہتا ہے' اکساتا رہتا ہے' حکم دیتا رہتا ہے۔ یہ ہے امارہ' جہاں یہ لفظ آیا ہے۔ یہیں قرآن نے ایک بات بڑھائی ہے۔ خواہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے' اپنی طرف سے یہ بات کہی ہے یا یہ اسی عزیز کی بیوی کا قول نقل ہے لیکن کہا یہ ہے کہ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ [5] (12:53)۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ بنیادی طور پر وہ نفس یہ نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ انسان کو برائی کی طرف ہی لے جاتا ہے۔ یہاں قرآن نے عیسائیت کے ایک عقیدے کو کاٹ کے رکھ دیا۔ عیسائیت میں یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ گناہگار پیدا ہوتا ہے۔ قرآن نے یہ کہا کہ یہ جو انسان کا نفس ہے وہ

---

[1] نفس الامارہ صرف 12:53 میں آیا ہے۔
[2] نفس اللوامۃ صرف 75:2 میں آیا ہے۔
[3] نفس المطمئنۃ صرف 89:27 میں آیا ہے۔
[4] حقیقت یہ ہے کہ انسان کے حیوانی جذبات اسے برائی کے لیے اکساتے رہتے ہیں۔ اس سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس پر خدا رحم کرے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❺ اس سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس پر خدا رحم کرے۔ (ایضاً)

برائی کی طرف بھی لے جاتا ہے لیکن جس پہ خدا کی رحمت ہو خدا کا رحم ہو وہ یہ نہیں کرتا۔ تو بنیادی طور پر یہ نفس کی چیز نہیں ہوئی کہ وہ برائی کی طرف لے جاتا ہے۔ برائی کی طرف وہ نفس لے جاتا ہے جو رحمِ خداوندی میں نہیں ہوتا۔ وہ میں الگ عرض کرونگا کہ یہ کیا چیز ہوگئی۔ قرآن تو، عزیزانِ من! دو دو لفظوں میں اس قدر بنیادی حقائق بیان کر جاتا ہے۔ یہ عیسائیت کا اتنا بڑا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ پیدائشی گنہگار پیدا ہوتا ہے۔ قرآن نے بھی، خواہ یہ اسی عزیز کی بیوی کا قول نقل تھا، کہا کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ (12:53)۔ امارہ کے معنی ہیں "بڑی شدت سے امر کرنے (اکسانے) والا"۔ لیکن اس کے بعد قرآن نے فوراً یہ کہہ دیا کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ نفس کرتا ہی یہ ہے، وہ ہوتا ہی اس کام کے لیے ہے، وہ گناہ کے لیے ہی آمادہ کرتا ہے، وہ ہمیشہ جرم کی طرف آمادہ کرتا ہے بلکہ یہ کہا کہ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ (12:53) اس سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس پر خدا رحم کرے۔

عزیزانِ من! درمیان میں آپ ادھر نفس مطمئنہ کی طرف چلے جائیے، لوامہ کی طرف میں بعد میں آؤنگا۔

نفسِ مطمئنہ کیا ہے؟

نفس کی تیسری اسٹیج مطمئنہ ہے۔ یہ قرآن کی اصطلاحات ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ان کے بنیادی معنی کی طرف جائیے تو انسان جھوم جاتا ہے۔ یہ ہے وہ نفس قرآن جو انسان کو جنت میں جانے کے لیے کوالیفائیڈ کر دیتا ہے کہ ہاں یہ ہے اصل مستحق۔ جسے جنت میں جانا ہے، اس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ o اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً o فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ o وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ❶ (89:27-30)۔ یہ ہے نفسِ مطمئنہ کی Balanced Mind (متوازن نفس) کی، وہ اسٹیج جس میں کوئی اضطراب نہیں، ریب نہیں، کشمکش نہیں۔ اطمینان سے یکسو ہو گیا ہے، صحیح فیصلے کیے ہیں، صحیح مقام حاصل کیا ہے اور یہی وہ مقام ہے کہ جس کو وہ کہتا ہے کہ جنت میں جانے کا اہل ہو گیا، قرآنِ کریم نے اسے اس کے لیے کوالیفائیڈ کر دیا، وہ جس کے قابل ہو گیا۔

---

❶ وہ شخص جس نے قانونِ خداوندی کے اتباع سے، سکونِ قلب کی طرح، دل کا صحیح اطمینان حاصل کر لیا ہو (13:28) یعنی جس کی ذات میں، صحیح نشوونما سے، پورا پورا توازن پیدا ہو چکا ہوگا (91:9) اُس سے کہا جائے گا کہ تیرا طریقِ زندگی قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ تھا، اس لیے تیری زندگی پسندیدہ خوش گواریوں کی حامل ہوگی۔ تجھے تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے حسبِ منشا آسائشیں حاصل ہوں گی۔ (لیکن اے رسولؐ! انہیں متنبہ کر دو کہ یہ چیز انفرادی طور پر حاصل نہیں ہو سکتی، اجتماعی زندگی سے ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ) تم ان لوگوں کی جماعت میں شامل ہو جاؤ جنہوں نے خدا کی محکومیت اختیار کر رکھی ہے یعنی جماعت مومنین میں۔ اور اس طرح اس جنتی معاشرہ میں داخل ہو جاؤ جو اس کے قانون کے مطابق متشکل ہوا ہے (9:119)۔ (اس دنیا میں بھی جنتی زندگی اور آخرت میں بھی جنتی زندگی۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

جنت ہو یا جہنم، اس میں اجتماعی طور پر ہی جانا ہوتا ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ یہ قرآن ہے، یہ کہیں بھی، کوئی بھی بات بیان کرے، وہ جو اس کا اپنا اصل مقصد ہے، اسے بیچ میں، ساتھ لے آتا ہے۔ یہ یہاں بھی لے آیا کہ یہ جنت یا جہنم میں جانا انفرادی چیز نہیں ہے، اجتماعی ہے۔ جسے آپ نجات کہتے ہیں وہ ہر فرد کی الگ الگ نہیں ہوتی۔ یہ روحانیت نہیں ہے کہ ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشتی۔ جب تک خود نہ پیو، پتہ ہی نہیں چل سکتا کہ یہ کیا ہے۔ یہ خانقاہیت نہیں ہے، یہ عیسائیت نہیں ہے، یہ Mysticism (باطنیت) نہیں ہے، یہ تو جنت میں جانا ہے۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ (89:29) دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر جانا ہے۔

میں نے عرض کیا ہے، عزیزانِ من! کہ قرآن کا کوئی مقام بھی آتا ہے جو اس کی اصل تعلیم ہے وہ اس کو ضرور فوکس (Focus) کر کے سامنے لاتا ہے۔ یہاں کہا کہ نفسِ مطمئنہ تو انفرادی ہے، ہر فرد کا اپنا اپنا ہے۔ ساری دنیا کے مذاہب یہی کہتے ہیں کہ اگر ہر فرد اپنے آپ میں پاکیزگی اختیار کر لے تو وہ نجات (Salvation) کے قابل ہو جائے، ترقی کے قابل ہو جائے، مکتی کے قابل ہو جائے۔ اگر ایسا کر لے تو اس فرد کی مکتی ہو جاتی ہے۔ فرد کا تزکیہ، پاکیزگی، سیرت کی بلندی، قرآن کا بھی مقصود ہے۔ وہ یہ کچھ کرنے کے لیے نفس کو کہتا ہے لیکن یہ ضرور واضح کر دیتا ہے کہ اس سے نجات نہیں ہوتی۔ یہ ایک ہیئت اجتماعیہ چاہتا ہے۔ ایک فرد تنہا جنت میں نہیں جاتا ہے، جماعت کے ساتھ جاتا ہے، جہنم میں بھی جماعت کے ہی ساتھ جاتا ہے۔ یہ سب کچھ قرآن میں ہے۔ آجکل جس جہنم کے اندر دنیا ہے اور بالخصوص ہم ہیں وہ تو آپ کو یاد ہے۔ ہمارے ہاں کا ایک ایک فرد جنت میں نہیں ہے بلکہ پوری کی پوری قوم جہنم کے اندر ہے۔ اور اگر کوئی یہ چاہے کہ جہنم میں کوئی ایک فرد، جنتی ہو جائے تو وہ نہیں ہو سکتا۔ وہ تو پوری جماعت کو ہونا ہوگا: یا جنتی ہونا ہوگا یا جہنمی ہونا ہوگا۔ میں یہ بات عرض کر رہا تھا کہ قرآن کوئی بات بھی کہے، کوئی حقیقت بھی بیان کرے، وہ جو اصل مقصود ہے، وہ اسے ضرور ساتھ لے آتا ہے۔ یہاں کہا کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ [1] (89:29-30)۔ جنت میں جانے کا یہ طریقہ ہے اور یہ ہے نفسِ مطمئنہ۔

نفسِ لوامہ اور انسانی ضمیر کی تشریح

اب آیئے نفسِ لوامہ کی بات کی طرف۔ اس کے معنی ہیں: ملامت کرنے والا۔ ہمارے ہاں ایک عام چیز ہے اسے ضمیر کی آواز کہا جاتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اپنے ضمیر سے پوچھو۔ ضمیر کی آواز کا شہرہ ہے اور کہتے ہیں کہ ضمیر کی آواز پر چلنا چاہیے، گویا ضمیر کوئی ایسی چیز ہے جو ہمیشہ صحیح بات کہتی ہے، جائز کہتی ہے، سچی بات کہتی ہے، حقیقت کی بات کہتی ہے۔ یعنی انسان کے اندر کوئی ایسی چیز رکھی ہوئی

---

[1] تم ان لوگوں کی جماعت میں شامل ہو جاؤ جنہوں نے خدا کی محکومیت اختیار کر رکھی ہے، یعنی جماعت مومنین میں تو اس طرح اس جنتی معاشرہ میں داخل ہو جاؤ جو اس کے قانون کے مطابق متشکل ہوا ہے (9:119)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہے جو غلط اور صحیح' حق اور باطل میں امتیاز کر دیتی ہے اور پھر انسان کو یہ بتا دیتی ہے کہ حقیقت کی بات کیا تھی۔ عزیزانِ من! انسان کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ حق اور باطل کی تمیز کر سکے۔ اگر یہ چیز انسان کے اندر ہوتی تو کسی فرد کو وحی کی ضرورت ہی نہ پڑتی' رسول کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ ہوتا یہ کہ انسان کے اندر یہ چیز موجود ہے' خود فیصلہ کر لے۔ حیوانات کی زندگی میں یہ بات ان کے اندر ہے۔ اس چیز کی میں مثال دیا کرتا ہوں کہ مرغی کے نیچے آپ کچھ بطخ کے اور کچھ مرغی کے انڈے رکھ دیجیے' کچھ وقت کے بعد جب ان سے چوزے نکلیں گے تو مرغی کے چوزے تو خشکی کی طرف بھاگیں اور بطخ کے چوزے پھڑک کر پانی کی طرف چلے جائیں گے۔ ان دونوں کو کس نے بتایا ہے؟ یہ غلط اور صحیح کی تمیز' یہ حق اور باطل کا امتیاز انہیں کس نے بتایا ہے؟ کوئی رسول تو ان کی طرف نہیں آیا۔ یہ چیز ان کے اندر رکھی ہوئی ہے' جسے جبلت کہتے ہیں' Instinct کہتے ہیں۔ یہ ہے ان کے اندر رکھی ہوئی بات۔ اس قسم کی کوئی چیز انسانی بچے کے اندر نہیں رکھی ہوئی۔ اس کو دیکھیے' بچہ ذرا گھٹنوں چلنے لگے' ماں کے لیے مصیبت بن جاتا ہے: وہ چولہے میں ہاتھ ڈال دیا' وہ مرچیں کھا گیا' آنکھوں میں لگا لیں' چیں چیں کر رہا ہے' پھر اس کے بعد ادھر سے اتر اتو پانی میں ڈبکیاں لے رہا ہے۔ حیوان کا کوئی بچہ ایسے نہیں کرتا۔ مرغی کا چوزہ کبھی پانی کی طرف نہیں جاتا ہے۔ یہ یہی حضرت اشرف المخلوقات ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کدھر دیکھیں گے' کیا کریں گے۔ اسی لیے رہنمائی کے لیے اسے خارج سے ضرورت پڑی ہے: وحی کے ذریعے' انبیائے کرام کے ذریعے' یہ بتانے کی کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔

ایک چیز تو اضافی ہوتی ہے جیسے اچھی اور بری' غلط اور صحیح کہتے ہیں۔ اسے Relative (اضافی) کہتے ہیں اور دوسری چیز وہ ہوتی ہے جسے کہتے ہیں کہ وہ فی الواقعہ ایک چیز ہے' فی الواقعہ وہ ایسی ہوتی ہے۔ اسے مطلق کہتے ہیں' اسے Absolute کہتے ہیں۔ جیسے خیر اور شر' جیسے غلط اور صحیح' جائز اور ناجائز یعنی یہ کہ ایک چیز فی الواقعہ ناجائز ہے' غلط ہے' باطل ہے۔ دوسری یہ چیز ہے کہ موقعہ محل کے لحاظ سے آپ کے نزدیک وہ اچھی ہے۔ آپ نے جس گاؤں میں جانا ہے' اُس کے لیے آپ نے چوراہے سے وہ راستہ اختیار کیا جو گاؤں لے جائے تو وہ صحیح راستہ ہے لیکن یہ اسی صورت میں صحیح ہے کہ جس گاؤں کی طرف آپ نے جانا ہے یہ اس طرف جاتا ہے۔ اگر آپ دوسرے راستے پہ چل پڑے جو اس طرف نہیں جا رہا تو یہ راستہ غلط ہے۔ وہ راستے تو دونوں ہی ایک جیسے ہیں۔ ان میں سے نہ کوئی صحیح راستہ ہے' نہ کوئی غلط راستہ ہے۔ آپ نے خود جس طرف جانا ہے اس کے لحاظ سے وہ صحیح اور غلط ہو جاتا ہے۔ اسے اضافی (Relative) کہتے ہیں تو دوسرا راستہ جو آپ کو مطلوبہ گاؤں تک لے جائے وہی آپ کے لیے صحیح ہوگا۔

مطلق خیر اور مطلق شر کا علم وحی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے

عزیزانِ من! عام درس سے باتیں یوں کچھ ادھر اُدھر ہٹ جاتی ہیں لیکن میں کوشش کرتا ہوں کہ بات اسی سطح پر رکھوں کہ بزم میں

اہلِ نظر بھی ہیں‘ تماشائی بھی تا کہ ہر ایک کی سمجھ میں بات آ جائے۔ انہیں کہتے ہیں اضافی یا Relative‘ اچھا یا برا ہونا۔ یہ فیصلہ انسان خود کر سکتا ہے۔ اپنے لیے خود ہی اس نے فیصلہ کیا کہ میں نے شہر کی طرف جانا ہے‘ یہ سڑک سیدھی جا رہی ہے۔ یہ سیدھی اس کے لیے صراطِ مستقیم بن جائے گی۔ اگر اس نے فیصلہ کیا کہ ماڈل ٹاؤن کی طرف جانا ہے تو یہ گمراہی ہو جائے گی۔ لیکن ایک چیز یہ ہے کہ وہ فی الواقعہ گمراہی ہے یا وہ فی الواقعہ صراطِ مستقیم ہے۔ یہ Relative (اضافی) نہیں ہے‘ یہ مطلق ہے۔ یہ چیز کہ اپنی حلال کمائی سے رزق حاصل کرنا ہے‘ یہ ہے صحیح‘ دوسرے کی محنت کو Exploit (سلب) کرنا ہے‘ یہ ہے باطل اور یہ ہمیشہ ہے‘ ہر حال میں ہے‘ ہر شخص کے لیے ہے‘ یہ بدل نہیں سکتی‘ یہ Relative (اضافی) نہیں ہو سکتی۔ آپ اپنے دوست کی عزت کرتے ہیں‘ کل ہی کو وہ دوست دشمن ہو جاتا ہے۔ پھر آپ اس کی عزت نہیں کرتے۔ یہ جو آپ نے عزت کی ہے‘ یہ Relative (اضافی) ہے۔ قرآن کا حکم ہے کہ ہر انسان واجب التکریم ہے۔ یہ مطلق ہے۔ اس میں اب یہ فیصلہ نہیں کرتے کہ یہ دشمن ہو گیا‘ یا یہ دوست ہو گیا‘ یا یہ اپنا ہے‘ یا بیگانہ ہے‘ یہ میری قوم کا ہے‘ یہ دوسری قوم کا ہے۔ یہ ایک حقِ مطلق ہے۔ یہ جو مطلق خیر یا مطلق شر ہے اس کا علم انسان کے اندر نہیں ہے۔ یہ صرف وحی کے ذریعے اس کو رسولوں کی معرفت ملا ہے۔ چونکہ وحی اور رسالت بندوں کے ہاں نہیں تھی یا کبھی آئی تھی مگر ان کے ہاں گم ہو گئی تھی۔ انہوں نے اپنا یہ دھرم بنا لیا کہ پیدائشی اعتبار سے ایک شودر پیدا ہوتا ہے‘ ایک برہمن پیدا ہوتا ہے‘ برہمن بچے کی ساری عمر عزت کی جائے گی‘ شودر کو جوتی کے تلے رکھا جائے گا۔ ان کے ہاں کا یہ دھرم ہو گیا۔ یہ باطل ہے۔ حق یہ ہے کہ ہر انسانی بچے کی پیدائش کے اعتبار سے کوئی نسبت نہیں ہے‘ کوئی اضافی بات نہیں ہے‘ اس کا انسان ہونا اُسے واجب التکریم بنا دیتا ہے‘ تکریم اس کا حق ہے۔

ضمیر کی آواز کیا ہے؟

عزیزانِ من! اب آیئے اس طرف جسے آپ ضمیر کی آواز کہتے ہیں۔ مسلمان کا بچہ گائے کا گوشت لذت لے لے کر کھا جاتا ہے‘ ہندو کے سامنے رکھیے‘ اسے قے آ جاتی ہے۔ یہ کیا ہے؟ کیا یہ ان دونوں کے ضمیر کی آواز ہے؟ کسی نے ان ہندوؤں سے یہ نہیں کہا کہ اس سے بچو‘ یہ گائے کا گوشت ہے اور اس مسلمان کے بچے سے یہ نہیں کہا: ”کھا جاؤ“۔ کیا یہ اس کے اندر کی آواز ہے؟ کیا ہے یہ آواز؟ اس ہندو کے بچے نے‘ جس سوسائٹی میں‘ جس ماحول میں‘ جس معاشرے میں‘ پرورش پائی ہے‘ جو اس کے کان میں بچپن سے آواز آتی چلی گئی ہے‘ جو کچھ وہاں آہستہ آہستہ بتایا گیا ہے‘ یہ چیز اس کے تحت الشعور میں آ گئی: جو گائے کا گوشت ہے وہ ہم نے نہیں کھانا۔ یہ آواز اس کے کان میں پڑی۔ مسلمان بچے کے کان میں ہی نہیں پڑی‘ بلکہ گائے کا یہ گوشت گھر میں پکنا شروع ہوا ہے‘ اس نے اپنے ماحول کا یہ اثر لیا ہے‘ اُس نے اپنے ماحول کا وہ اثر لیا ہے‘ تو ضمیر تو اسی کا نام ہے۔ حقِ مطلق یا خیرِ مطلق یا شرِ مطلق کے لیے یہ فیصلہ کن چیز نہیں ہے۔ یہ تو جس ماحول میں وہ ضمیر پرورش پائے گی‘ جس ماحول میں پیدا ہو گی‘ جس ماحول کا اثر لے گی‘ اس قسم کی اس کی ضمیر بن جائے گی۔ یہ سارے

بت پرست ضمیر کی آواز پہ چلتے ہیں۔ ایک انسان کو یعنی ایک نبی کو حضرت عیسیٰ ◆ کو خدا کا بیٹا ماننے والے ضمیر کی آواز پہ چلتے ہیں۔ آپ اس کی مخالفت کرتے ہیں تو گویا ضمیر کی آواز پہ کرتے ہیں۔ مگر یہ چیز نہیں ہے۔

ضمیر کی آواز حق اور باطل کا فیصلہ نہیں کر سکتی

عزیزانِ من! جسے انسان کی ضمیر کی آواز کہا جاتا ہے' وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرنے کا معیار نہیں ہے۔ جس قسم کے معاشرے میں کوئی پرورش پائے گا' اسی قسم کی اس کی ضمیر ہو جائے گی۔ اور جب اس کے خلاف کوئی کام ہوگا' تو اس کی ضمیر اس کے خلاف ابا کرے گی' اس کے خلاف نفرت کرے گی۔ یہ لوامہ ہوا۔ انسانی نفس کے اندر یہ بات ہے کہ وہ ملامت کرتا ہے۔

نفسِ لوامہ کا عمل

میں آگے چل کر بتاؤنگا کہ جب آہستہ آہستہ آپ اس ابا کرنے کی پرواہ نہیں کرتے' اسے دباتے چلے جاتے ہیں' جذبات آپ پر غالب آتے چلے جاتے ہیں' پھر وہ ملامت بھی نہیں کرتا۔ وہ جرائم عام ہو جاتے ہیں۔ یہ جتنے جرائم پیشہ ہیں' پھر ان کا ضمیر ان کو ملامت نہیں کرتا' بلکہ وہ انہیں قابلِ ملامت ہی نہیں سمجھتا۔ وہ جن چیزوں کو قابلِ ملامت بھی سمجھتا ہے' وہ وہی ہوتی ہیں جو شروع سے اس کے ذہن میں ڈالی گئی ہیں کہ یہ غلط ہیں۔ اب یہ چیز سمجھ لیجیے کہ انسان کا ضمیر یا نفسِ لوامہ ان چیزوں پہ ملامت کرتا ہے جن کے متعلق پہلے سے اس کو بتایا گیا ہے کہ یہ بری ہیں۔ ٹھگوں کا بیٹا اس کی ایک مثال ہے۔ اسے بچپن سے تعلیم دی گئی ہے کہ جب تک تم ایک شخص کو مار نہ دو گے اس وقت تک تمہاری شادی نہیں ہو سکتی' اور یہ بھی کہ یہ کالی دیوی کا حکم ہے۔ وہ مارتا ہے۔ وہ ایک شخص تو مارتا تھا۔ پتہ نہیں اب بھی مارتے ہیں یا نہیں۔ اب تو ساری دنیا ٹھگ ہو گئی ہے۔ الگ ٹھگوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ جس طرح اقبالؒ (1877-1938) نے ابلیس کی زبان سے لکھا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے درخواست دی کہ جی! مجھے اب ریٹائر کر کے چھٹی دیجیے' میں گھر بیٹھوں۔ کہنے لگے: کیوں؟ کہنے لگا: اب تو ہر شخص شیطان ہے' یہاں میری ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ تو اب الگ ٹھگوں کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن ان کے ہاں یہ عقیدہ تھا' یہ ان کا دھرم تھا۔ ٹھگوں کا بچہ جب یہ جان لیتا تھا' دوسرے کا گلا گھونٹتا تھا تو اس کا ضمیر اس کو ملامت نہیں کرتا تھا۔

ابلیس کی خدا سے چھٹی کی درخواست

عزیزانِ من! سوال یہ ہے کہ اس کا ضمیر اسے کیوں منع نہیں کرتا تھا؟ وہ ضمیر تو وہی تھا جو بچپن سے اس کو سکھایا گیا تھا' سمجھایا گیا تھا۔ اس لیے وہ اس کی ملامت نہیں کرتا تھا۔ تو اسے یاد رکھیے کہ انسانی نفس کے اندر یہ ایک خصوصیت ہے۔ آپ میرے یہ الفاظ سن رکھیے کہ جس چیز کو وہ برا سمجھتا ہے' اس پر وہ ملامت کرتا ہے۔ پھر سنیے! اگر وہ ضمیر زندہ ہے تو جس کو وہ برا سمجھتا ہے' وہ اسے ہی برا کہتا ہے' یہ نہیں ہے کہ جس چیز کو ضمیر برا کہہ دیتا ہے وہ فی الواقعہ بری ہوتی ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے' کہ اس نظامِ سرمایہ داری میں دوسروں کی محنت کو

Exploit (غصب) کرتا ہے' جو اس نظام کو صحیح سمجھتے ہیں' انہیں کبھی اس سلب و نہب کی کرک ہی نہیں آتی۔ وہ اسی نظام ہی سے تو زیادہ سے زیادہ نچوڑتے ہیں' ان کا ضمیر اس پہ انہیں ملامت نہیں کرتا۔ تو یہ سن رکھیے کہ ضمیر حق اور باطل کا فی الواقعہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ جس بات کو وہ حق سمجھتا ہے' اس کی تائید کرتا ہے' جسے وہ باطل سمجھتا ہے وہ اس کی تردید کرتا ہے' اس پر ملامت کرتا ہے' وہ بھی اس وقت تک جب تک وہ زندہ رہتا ہے۔ زندہ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ جرم عام ہو جاتا ہے تو پھر وہ امارہ بن جاتا ہے' اسے برائی کے لیے آمادہ کرتا رہتا ہے' اکساتا رہتا ہے۔ المختصر لوامہ اس حد تک رہتا ہے جب تک وہ جس چیز کو برا سمجھے اس پہ وہ ٹوکتا رہے۔

نفس کے متعلق قرآن کی تعلیم

عزیزانِ من! اب آ گئی۔ نفس کے متعلق قرآن کی تعلیم۔ اس کے لیے کہا ہے کہ بچپن ہی سے بچے کو یہ تعلیم دو' یہ Environment (ماحول) دو' ایسا معاشرہ دو کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے برا کہا ہے' وہ اسے برا سمجھے' جسے اس نے اچھا کہا ہے' وہ اسے اچھا سمجھے۔ اب اس کی ضمیر کی آواز صحیح آواز ہوگی۔ یہ ہے وہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر شیطان کا گھومتا گھماتا خیال بھی کبھی ان کے سامنے آ جاتا ہے تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کے اندر پناہ لے لیتے ہیں۔ ''گھومتا گھماتا خیال'' بھی آ جائے تو یہ اس لیے ہے کہ وہاں تعلیم' تربیت' پرورش ایسی ہوئی ہے کہ جو مطلق حق ہے اسے حق سمجھا ہے' جو مطلق شر ہے' باطل ہے' اسے شر اور باطل سمجھا ہے۔ کسی وقت ایسا ہو جاتا ہے یا ہو سکتا ہے کہ خیال نہ رہے' بھول جائے' سہو ہو جائے' نسیان ہو جائے تو کہا کہ لَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا [1] (28:77)۔ یہ وہ بات ہے مگر وہ ارادۃً یہ نہیں کرتا' جان بوجھ کر یہ نہیں کرتا' اسی کے لیے یہ کہا ہے کہ نسیان سے کبھی ہو سکتا ہے کہ ایک چیز جو باطل تھی' جو غلط تھی' اسے اس وقت غلط نہ سمجھا ہو لیکن جونہی وہ خیال آتا ہے جسے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کہتے ہیں' وہ خدا کے قوانین کے پروں کے نیچے پناہ لیتا ہے۔ عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو یہ تعوذ محض رسم ہی رہ گئی۔ وہ بھی صرف اس وقت جب تلاوتِ قرآنِ کریم کی جائے اور وہ تلاوت بھی رسم ہے' اس سے پہلے یہ کچھ کہنا بھی رسم ہے' ورنہ یہ تعوذ بڑی چیز ہے۔

تعوذ کا مفہوم

تعوذ جو عَوَّذَ سے ہے' اس کا مادہ (Root) ''ع وذ'' ہے۔ آپ یہ دیکھیے کہ عرب اسے کہاں استعمال کرتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب مرغی کے چوزے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں' مرغی ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ انہیں چھوڑ بھی دیتی ہے تو وہ اِدھر اُدھر دانہ

---

[1] اسے نہ بھولو کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی نہیں جس میں انسان کا منتہائے نگاہ مال و دولت جمع کرنا ہے اور بس' زندگی اس کے بعد بھی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ڈنکا چن رہے ہوتے ہیں۔ اگر چیل کا سایہ اوپر آتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح بھاگ کر مرغی کے پروں کے نیچے آجاتے ہیں۔ ان بچوں کا اس طرح بھاگ کر مرغی کے پروں کے نیچے آجانا **عوّذ** کہلاتا ہے۔ اب آپ **اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم** کا مطلب و مفہوم سمجھیے۔ اس ''چیل'' کے خطرے سے میں خدا کے قوانین کے پروں کے نیچے پناہ لیتا ہوں' اگر بھول کر بھی کوئی ایسی بات ہوجاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ پھر یہ اعوذ چلتا چلتا کہاں آ گیا۔ یہ تعویذ کا لفظ وہیں سے ہی تو ہے۔

حضرت صاحب کا تعویذ

عزیزانِ من! اب آپ نے جو خطرات سے پناہ ڈھونڈی تو وہ یہ ہے کہ آپ حضرت صاحب کے اس ایک تعویذ کو گلے میں لٹکا کے چلیے' معاملہ ختم ہوگیا' نہ خدا کے قانون رہے' نہ وہ تعوذ' نہ اعوذ باللہ' نہ پھر وہ شیطان۔

تعویذ کا لفظ ہی **عــوّذ** سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ تم کہاں پھر رہے ہو' ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ حفاظت کیسے ملے گی۔ حفاظت کے لیے تعویذ ڈالتے ہیں' آپ کے گلے میں ہی نہیں بلکہ اوتے دیوار نال ٹنگ دیندے ہیگے نیں۔ ❶ اس سے سارا گھر ہی محفوظ ہوگیا۔ چل بھئی' خدا کا قلعہ بنادیا' اعوذ باللہ حضرت صاحب کے تعویذ میں آ گیا۔ بڑا خوبصورت شعر ہے:

بہک بہک ❷ کے کہاں آ گیا ہے دیوانے
مقامِ سود و زیاں آ گیا ہے دیوانے

بہک بہک ❷ کے یہاں آ گیا۔

خدا کے قانون کے پروں کے نیچے آنا

عزیزانِ من! میں نفسِ لوامہ کی بات کر رہا ہوں۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ بچے کی تعلیم' تربیت' پرورش' ماحول' معاشرہ' ایسا کر دو جسے اب آج کی اصطلاح میں Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کہتے ہیں کہ اس کے نفسِ غیر شعوری کے اندر یہ چیزیں آ جائیں کہ یہ حق ہے' یہ باطل ہے' یہ خیر ہے' یہ شر ہے' یہ جائز ہے' یہ ناجائز ہے۔ اگر یہ چیز اس کے اندر موجود ہے تو وہ بالارادہ تو کبھی کرے گا ہی نہیں۔ یہ ہوگی ضمیر کی آواز۔ اگر کہیں بھول چوک سے' سہو و نسیان سے' بےخبری بےخیالی سے' غفلت سے' کوئی قدم غلط اٹھتا ہے تو اٹھنے کے فوراً ہی بعد' قرآن کہتا ہے کہ اگر وہ خیال گھومتے گھماتے بھی اس کے سامنے آتا ہے' تو فوراً اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے: غلط ہوگیا اور پھر وہ رکتا ہے' پھر وہ خدا کے قانون کے پروں کے نیچے آتا ہے' وہاں پناہ لیتا ہے' وہیں رک جاتا ہے' غلط راستے کے اوپر زیادہ قدم

---

❶ وہ تو اسے دیوار پر بھی لٹکا دیتے ہیں۔

❷ اگلے ہی درس میں (چوبیسواں باب) پرویزؒ نے اس شعر کے پہلے مصرعہ کی خود ہی تصحیح کر دی کہ یہ یوں ہے: بھٹک بھٹک کے کہاں آ گیا ہے دیوانے

نہیں چلتا' چند قدم کے بعد فوراً واپس آ جاتا ہے۔ یہ فوراً لوٹتا ہے اسے عربی زبان میں تو بہ کہتے ہیں اور پھر یہ قرآن ہے' کہتا ہے کہ یہ نفسِ لوامہ تھا جس نے اس کو روک دیا کیونکہ اسکے اندر صحیح تربیت سے' تعلیم سے' خدا کی دی ہوئی یہ چیز رچ بس گئی تھی۔ کسی نے خود فیصلہ کر کے یہ نہیں دی تھی۔ اگر ماں باپ نے ہی فیصلہ کرنا ہوتا' تو ہندو اپنے بچوں کو وہی تعلیم دیتے ہیں' عیسائی اپنے بچوں کو وہی تعلیم دیتے ہیں' سب اپنے بچوں کو وہی تعلیم دیتے ہیں' ہم اپنے بچوں کو وہی تعلیم دے رہے ہیں مگر یہ وہ بات نہیں ہے۔

مطلق خیر اور مطلق شر وہ ہے' جو قرآن کا یا خدا کا بتایا ہوا ہے۔ اسی کی تعلیم و تربیت دی جائے۔ یہ تعلیم و تربیت صرف پڑھانے لکھانے کی ہی بات نہیں ہے' یہ تو جیسے انسان سانس لیتا ہے' اس طرح کی یہ ایک چیز ہے۔ انسان کے اندر یہ خیالات اور معاشرے میں یہ خیالات عام کیے جائیں۔ جب یہ نہ ہو تو صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ صاحب! کیا کیا جائے'' اب رشوت کے بغیر کام ہی نہیں چلتا'' ہر گھر سے یہ آواز آ رہی ہے' بچہ اسے سنے گا' اسے بیوی کہے گی کہ کیا آپ نے یہ جھوٹ بولا' فریب دیا؟ وہ کہے گا کہ ہو ہی یہ رہا ہے' اس کے بغیر بھوکا مرنا ہے۔ بچہ سن رہا ہے۔ اس کا ضمیر مرتب ہو رہا ہے' آپ اس کے ضمیر کو بنا رہے ہیں تو جب وہ بڑا ہوتا ہے تو پھر اس سے آپ یہ توقع کرتے ہیں کہ یہ غلط کو غلط کہے۔ کیسے کہے؟ جسے تم نے صحیح کہا تھا وہ اسے صحیح کہہ رہا ہے۔ تم نے ہر قسم کے فریب کو' ہر قسم کی Exploitation (سلب و نہب) کو' جائز قرار دیا تھا۔ وہ اسے جائز سمجھ رہا ہے۔ اب اس کا ضمیر تو ملامت نہیں کرے گا۔

ضمیر کے اندر فی الواقعہ کچھ نہیں

عزیزانِ من! نفسِ لوامہ کی یہ بات' میرا خیال ہے' آپ نے سمجھ لی۔ یہ بڑی اہم چیز ہے کیونکہ ہمارے ہاں یہ ایک غلط تصور ہے کہ ضمیر کی آواز انسان کو صحیح بات بتاتی ہے۔ نہیں' ضمیر کے اندر فی الواقعہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ ضمیر بنائی جاتی ہے۔ اسے معاشرہ بناتا ہے' تعلیم بناتی ہے' تربیت بناتی ہے' ماں باپ بناتے ہیں۔ یہ وعظ و نصیحت سے کم بنتی ہے۔ جو احوال اور کام ہوتے ہیں' یہ ان سے بنتی ہے۔ اب آپ نے یہ دیکھ لیا کہ نفسِ لوامہ کی کتنی اہمیت ہے۔ جہاں ضمیر کا یہ غلط تصور ہو' وہ انسان کو کبھی برائی سے نہیں روک سکتا۔ وہ تو امارہ ہی بن جاتی ہے۔

قرآنی تعلیم و تصور کی اگر بنیادوں پر' جو خدا نے دی ہیں' ضمیر مرتب کی ہوئی ہو' تو پھر وہ ضمیر ایسے وقت میں' جو سہو و نسیان سے غلط قدم اٹھتا ہے' اس سے روک دیتی ہے۔ بالارادہ تو مومن غلط قدم اٹھاتا ہی نہیں۔ غلط قدم سہو و نسیان سے ہی اٹھتا ہے اور وہاں وہ جو نفسِ لوامہ ہے' وہ روک دیتا ہے کہ غلط قدم اٹھ گیا ہے۔ اور وہ رکتا ہے' پھر واپس لوٹتا ہے' پھر اس چوراہے پہ پہنچتا ہے جہاں سے اس نے غلط قدم اٹھایا تھا' غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ توبہ ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ کچھ ابھی تک منفی ہے' یہ Negative ہے۔ جو غلطی کی تھی صرف اس کا ازالہ

ہوا ہے۔صحیح راستہ ابھی نہیں آیا۔اس کے بعد اس چوراہے سے جب وہ اس راستے پہ قدم رکھے گا جو اس کی منزل کی طرف جاتا ہے تو یہ عملِ صالح ہوگا۔اسی لیے قرآن میں توبہ اور عملِ صالح دونوں اکٹھے آئے ہیں۔ضمیر نے یہ کیا کہ وہ اسے یہاں تک لے آیا۔اب اس کی تعلیم' قرآن کے حقائق' اس کے سامنے ہیں' وہ بتاتے ہیں کہ اسے کس طرح اس پر عمل کرنا ہے لہٰذا اس طرف جب انسان گامزن ہوجاتا ہے تو پھر یہ صحیح راستے پر چل پڑتا ہے۔قرآن کی رو سے صحیح اور غلط' حق اور باطل' جائز اور ناجائز' خیر وشر' کے امتیاز کا Process (طریق عمل' طریق کار) یہ ہے۔ ان میں سے ایک کو چھوڑنے کا اور دوسرے کو اختیار کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔اسی لیے قرآن نے اس نفس لوامہ کو شہادت میں پیش کیا ہے۔یہ بڑی چیز ہے۔لیکن میں پھر عرض کردوں کہ اگر ہم نے اس نفس کی ترتیب ہی غلط انداز میں کی ہے' تو سب سے بری چیز بھی یہی ہے۔ضمیر کی آواز سے' اندر کی آواز سے' انسان مطمئن ہوجاتا ہے حالانکہ وہ باطل کی آواز ہوتی ہے۔اسی لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ [1] (75:3)۔یہ بات تھی کہ وہ جو ان کا انکار تھا وہ تو پیچھے سے چلا آرہا ہے۔

خواہش کا پیدا ہونا بھی ایک نشان قائم کرتا ہے

عزیزانِ من! میں عرض کیے چلا آرہا ہوں کہ دین کی بنیاد قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے: انسان کا ہر کام حتیٰ کہ ہر ارادہ' ہر خواہش' ہر آرزو' خواہ وہ ناتمام ہی کیوں نہ ہو' دل میں خواہش کا پیدا ہونا' ایک نتیجہ مرتب کرتا ہے۔غلط کام وعمل وارادہ غلط نتیجہ پیدا کرے گا اور صحیح عمل کا صحیح نتیجہ۔جسے خدا نے غلط اور صحیح قرار دیا ہوا ہے وہی حقیقت میں غلط اور صحیح ہے۔ہر عمل نتیجہ پیدا کرتا ہے۔اس کے نتائج اس زندگی کے اندر ہی سامنے آنے شروع ہوجاتے ہیں کیونکہ اس اور اُس زندگی کا فرق ہمارا پیدا کیا ہوا ہے۔زندگی جوئے رواں است' رواں خواہد بود۔یہ زندگی تو ایک چلتی ہوئی ندی ہے۔اسے محض' یونہی کہی ہوئی کوئی بات نہ سمجھو۔پہلے وہ اس دیوار سے باہر تھے؟ اب اس موت کے بعد وہ دیوار کے نیچے سے اندر آ گئے۔اب آپ دیوار کو دیکھ کر کہہ رہے ہیں کہ زندگی ختم ہوگئی' نہیں' ایسا نہیں ہے۔ انسان کے اعمال کے جو نتائج ہیں وہ اسے بھگتنے پڑتے ہیں اور اعمال میں' میں نے عرض کیا ہے کہ خیالات اور ارادے بھی آجاتے ہیں۔انسان کو ان کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔اچھے ہیں تو ان کا اچھا نتیجہ' غلط ہیں تو برا نتیجہ۔اب وہ نتیجہ یہاں بھی مرتب ہوتا ہے' آگے بھی چلتا ہے' بلکہ آگے چل کر میں عرض کروں گا کہ قرآن نے کہا ہے کہ وہ جنت اور جہنم تو انسان کے اندر کا نفس یہاں سے اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے۔قرآن نے کہا ہے کہ یہاں مستور

---

[1] کیا انسان اپنے دل میں یہ خیال کیے بیٹھا ہے کہ جب وہ مر مرا کر ختم ہو جائے گا تو دوبارہ زندہ نہیں ہوگا؟(36:78; 37:16)۔(اور اس طرح وہ اپنے غلط اعمال کی پاداش سے بچ جائے گا۔) کیا وہ سمجھتا ہے کہ جس بنیاد پر زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے' وہ موت سے منتشر ہو جاتی ہے اور پھر مجتمع نہیں ہو سکتی؟ یہ اس کا خیالِ خام ہے۔ (مفہوم القرآن ۔پرویز)

ہوتا ہے' وہاں ظاہر ہوجاتا ہے۔یعنی یہاں وہ نتیجہ چھپا ہوا ہوتا ہے' وہاں بے نقاب ہوجاتا ہے۔ اورقرآن کے دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ جہنم تو تمہیں اب بھی دیکھ رہی ہے' تم اسے نہیں دیکھ رہے۔ یہ ہے اصل چیز۔اس کے لیے قرآن نے مختلف مقامات پہ سمجھایا ہے۔ جو اس کے منکر تھے کہ نہیں صاحب! جو مر گیا' مر مرا گیا' اس کی ہڈیاں' جسم' کھال' بال' ختم ہو گئے اور کچھ باقی ہی نہیں رہا۔ان سے بھی یہ کہا کہ جس خدا نے تمہیں Nothingness(عدم) سے پیدا کیا ہے' وہ اس پہ قادر ہے کہ تمہیں دوبارہ بھی پیدا کر دے۔ یہ بڑی عمدہ علمی دلیل ہے۔

عدم کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا

عزیزانِ من! اب تک کا علم اور اس کے بعد بھی ایسا نظر آئے گا کہ انسان کا انتہائی علم بھی' یہ نہیں بتا سکے گا کہ جسے عدم (Nothingness) کہتے ہیں' اس کے معنی کیا ہیں۔ Nothingness(عدم) کا ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا کہ کچھ نہ ہو اور شے بھی پیدا ہو جائے۔ یہ جو ہمارے ہاں کی محسوس عالم کی دنیا ہے اس میں کچھ تو ہو' جس سے بات کچھ آگے بنے۔خوبصورت بات ہے: لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں ''لگاؤ''۔ جب کچھ بھی نہ ہو تو دھوکا کھائیں کیا'[1] ''لاگ'' ہو تو اس کو ہم سمجھیں ''عداوت''۔''Nothingness(عدم) سے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آج بھی بڑے سے بڑا Scientist (سائنسدان) یہ دیکھتا ہے تو مبہوت ہوجاتا ہے' وہ وہاں تک تو Cause & Effect کی' علت اور معلول کی' کڑیاں ملاتا چلا جاتا ہے کہ اس سے یہ بنا پھر اس سے یہ بنا' اس آکسیجن اور ہائیڈروجن کے دو 'قطروں'' سے پانی کا ایک قطرہ بن گیا۔ یہ آکسیجن کیسے بن گئی؟ یہاں آ کر پھر وہ اور ایک کسان' یا گدھا چرانے والا' دونوں ایک ہی مقام پہ ہوتے ہیں: نہ وہ بتا سکتا ہے' نہ یہ بتا سکتا ہے۔

قرآن نے دلیل یہ دی ہے۔ بڑے سے بڑے عالم کے لیے' Scientist (سائنسدان) کے لیے کہا ہے کہ تم یہ بتاؤ کہ Nothingness(عدم) سے Being(وجود) کیسے بن گیا۔تم زیادہ سے زیادہ یہی کہو گے کہ یہ جو جسم انسانی ہے جس طرح سے یہ فرسودہ ہو گیا' خاکستر ہو گیا' اس کا کچھ نہ کچھ تو پھر بھی باقی ہے' راکھ ہی سہی۔ کہتے ہیں کہ ہڈیاں پھس پھسا گئیں' یہی سہی' کیڑے کھا گئے' کیڑوں کے اندر چلی گئیں' او کچھ تو ہے۔اور تم تو اس مقام پہ کھڑے ہو' جہاں یہ کہتے ہو کہ '' کچھ نہیں'' تھا اور '' وہ کچھ ہو گیا'' تو جو '' کچھ نہیں'' سے '' کچھ کر دینے والا'' ہے کیا وہ اس سے نہیں بنا سکتا؟

عزیزانِ من! قرآن بڑی عجیب دلیل دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو چیزیں موجود ہوں' ان کو نئی نئی ترتیب سے' اِدھر سے اُدھر' اُدھر سے اِدھر کرتے چلے جانا بس کیا یہ اتنا ہی ہوتا ہے جسے ہم تخلیق Creation کہتے ہیں۔وہ جو عالمِ امر ہے اس میں ہے کہ کچھ نہ ہو تو کچھ بنا

---

[1] لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا۔ (غالب)

دیا جائے۔تو کہا کہ کیا وہ یہ نہیں کرسکتا اور اگر ''عظام'' کے معنی ہڈیاں نہیں لینا' تو اس کے بنیادی معنی لیجیے۔''عظام'' ''ع ظم'' سے ہے۔وہ بڑی مضبوط سخت شے' جس کے اوپر کوئی عمارت اٹھتی ہے' وہ بنیاد کا پتھر ہوجاتا ہے۔ان عربوں کے ہاں زمیندار کے ہل کے نیچے' وہ اس کے اندر بہت سخت لکڑی لگاتے تھے۔وہ لوہے کا پھالا ہوتا تھا۔یہ ''عظم'' کہلاتا تھا۔میں یہ ''ظ'' کے ساتھ ''عظم'' والی بات کہہ رہا ہوں' ''ز'' کے ساتھ نہیں۔یہ ''بنیادی چیز'' ہے۔کہا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ جس چیز پہ انسان کی زندگی کی بنیاد ہے' تم اوپر کی عمارت کو دیکھ کر کہتے ہو کہ یہ تو ختم ہوگئی۔وہ جو بنیاد ہے وہ تو ہم نے Nothingness (عدم) سے پیدا کی تھی۔وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس پہ پھر عمارت استوار ہوسکتی ہے۔یہ ہے دلیل' جو دی ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ القیٰمۃ کی تیسری آیت تک ہی آج آئے۔میں سمجھتا ہوں کچھ کام کی باتیں ہوگئیں۔آیت 4 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

●.....●●●.....●